© rasailojaraid.com

# "اپنی اصلاح آپ"

(جناب ابوالسلام نعیم صدیقی صاحب)

[ یہ ایک تقریر ہے جو جماعت اسلامی لاہور کے ایک ہفتہ وار اجتماع میں کی گئی تھی۔ اب اسے قلمبند کر کے پیش کر رہا ہوں۔ بعض مواقع پر کچھ کلمات کا اضافہ کیا جا رہا ہے ——— ن۔ص ]

اسلام میں تعمیر سیرت اور اصلاح کردار کی اصل ذمہ داری ہر شخص کے اپنے اوپر عائد ہوتی ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے میں حیاتِ اجتماعیہ کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہتا۔ میرے نزدیک آدمی تکمیلِ ذات کے لیے صحیح نظامِ جماعت، پاکیزہ معاشرے اور صالح ماحول کا بدرجہ محتاج ہے اور ناسازگار اجتماعی ماحول میں تنہا کسی فرد کا اپنی ذات کی اصلاح و تعمیر کی سعی کرنا ایک ایسا کٹھن امتحان ہے کہ جس کا تصور ہی دل کو لرزا دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ برحق ہے کہ عنداللہ ہر شخص اپنا ذمہ دار آپ ہے۔ ہر شخص کو خود جوابدہی کرنی ہے۔ ہر شخص سے اس کی متاعِ قوت و حیات اور اس کے خزانۂ سیرت و کردار کے بارے میں علیحدہ طور پر محاسبہ ہونا ہے کہ اس نے اس کی حفاظت میں کس درجہ کی چوکسی دکھائی، اس کے استعمال میں کہاں تک احتیاط اور حکمت سے کام لیا اور اس کی نشو ونما کے لیے ممکن العمل تدابیر سے کہاں تک کام لیا۔ وہاں تو ہر شخص کو عدالتِ الٰہیہ میں اس وقت تک اپنے پیروں پر کھڑے رہنا ہوگا جب تک وہ یہ حساب نہ دے دے کہ اس نے اپنی عمر کن مقاصد و مشاغل میں کھپائی، اس نے جوانی کا خزانۂ قوت کس مہم میں صرف کیا، اس نے کس طریقے سے کیا کچھ آمدنیاں حاصل کیں، ان آمدنیوں کو کن راستوں سے خرچ کیا اور حقیقت کا جتنا کچھ شعور اور فرائض اور ذمہ داریوں اور حلال و حرام کا جتنا کچھ علم اسے ہو سکا اس کے مطابق عمل کرنے میں کہاں تک سرگرمی دکھائی۔ اپنی ذمہ داری کے اس بوجھ میں وہ کسی دوسرے کو شریک نہ کر سکے گا اور دوست، اور عزیز اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شانہ بشانہ کھڑے ہو کر اس گھڑی کے کرب میں کوئی حصہ نہ لیں گے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی اس بات کی گنجائش ہے اور ضرور ہے کہ ناسازگار ماحول کی وجہ سے ایک شخص کو عدالتِ آخرت کے محاسبے میں الاؤنس ملے اور جن غیر اختیاری مزاحمتوں اور جبری رکاوٹوں سے دوچار ہو کر وہ بے بس ہوتا رہا ہے ان کی اسے منہائی دی جائے، لیکن ناسازگار ماحول سے کشمکش کرنے کی ذمہ داری سے وہ کسی حال میں بری نہیں ہو سکتا۔ آخر ایک پاکیزہ نظامِ جماعت، ایک صاف ستھرا معاشرہ اور ایک سازگار ماحول مہیا کرنا بھی تو خود افراد ہی کی ذمہ داری ہے اور اس مقصد کے لیے جدوجہد کا آغاز کسی ایک فرد ہی کی دعوت سے ہوتا ہے۔ اب اگر فرد پر بنیادی اور ابتدائی ذمہ داری نہ رکھی گئی ہو تو ایک ناسازگار ماحول ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقدر ہو کے رہ جائے گا اور وہ ناسازگار جبری ماحول افراد کے لیے ایک مستقل عذر بن جائے گا۔ یہ چکر پھر کہیں سے ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ اصلاح کا اولین اور براہِ راست مخاطب فرد ہے۔ خدا کے دین کی پہلی پکار ہم میں سے ایک ایک کی روح و شخصیت سے ہے۔ اس کا پہلا پیغام "قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ" کا پیغام ہے۔ اس کے پورے نظامِ تربیت کا منشا یہ ہے کہ ہم اپنے لیے اپنے ہی اندر ایک مربی و مزکی فراہم کریں۔ خارجی تعاون کے بھی ہم محتاج ہیں اور حصولِ علم اور اصلاحِ عمل میں بیرونی امداد ہمارے لیے نہایت ضروری بھی ہے اور حد درجہ مفید بھی۔ مگر اپنی شخصیت کے اصل معمار ہم خود ہیں اور ہمیں اپنی اصلاح کی سب سے بڑھ کر اپنی مدد کی ضرورت ہے۔

**خارج سے مدد** | خارج میں انسانی شخصیت و کردار کی درستی کے لیے جو عوامل کام کرتے ہیں ان میں سے ایک قانون کی طاقت ہے۔ مگر قانون کی طاقت صرف ان اجتماعی اعمال پہ گرفت کر سکتی ہے جو واضح طور پر دوسروں کے لیے ضرر رساں ہوں اور جن کے لیے کافی شہادت بہم پہنچ جائے اور شہادت کی مدد سے واقعات کی صحیح صحیح تصویر و تعبیر سامنے آ جائے۔ قانون کی طاقت اپنے فیصلوں میں غلطی کر سکتی ہے، شہادت ناکافی ہونے پر بے بس ہو سکتی ہے، نجی اعمال کے دائرے میں بے تعلق بھی رہتی ہے، وہ محض برائی کے انسداد کی منفی تدابیر تو کر سکتی ہے، مثبت طور پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعمیرِ کردار کا فریضہ انجام نہیں دے سکتی اور پھر اعمال کے ظاہری پردوں کے پیچھے رزمِ خیر و شر کا جو ہنگامہ بپا ہے اُس تک دسترس نہیں رکھتی۔

دوسری طاقت رائے عام کی طاقت ہے جو ہمیں برائی سے رکنے اور بھلائی کی طرف بڑھنے میں مدد دے سکتی ہے۔ معاشرے کی اچھی مستحکم روایات، نظامِ تعلیم کی طرف سے ذہن کی آبیاری خاندان اور حلقۂ ربط و تعارف میں قائم شدہ اقدار اور کسی اصولی جماعت کا نظامِ تربیت و احتساب یہ سارے عوامل ہمیں بڑی مدد دیتے ہیں۔ لیکن یہ عوامل بھی ہماری رفتار و گفتار ہی تک رسائی رکھتے ہیں اور ہمارے اس عالمِ باطن میں نہیں اتر سکتے جس کے اندر ہمارے سارے نظامِ کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ خیال کی ندی کا وہ پہلا چشمہ جو ہمارے مرکزِ انا سے پھوٹتا ہے اور جس سے عمل و کردار کی ساری لہریں اُٹھتی ہیں، اس پر رائے عام کو بھی تصرف حاصل نہیں ہے۔

باہر سے ایک مدد ہمیں نفسیاتی تجزیہ کاری کے فن سے ملتی ہے۔ نفسیاتی تجزیہ کار ہماری ذہنی سرزمین کی کھدائی کر کے بگاڑ کے کسی خاص بیج اور فتنہ کی کسی ایک جڑ کی نشاندہی تو کر سکتا ہے، مگر وہ اصلاح کے لیے ہمیں مضبوط ایمانی جذبے اور انقلابی درجے کی قوتِ ارادی سے مالا مال نہیں کر سکتا۔

یہ سارے عوامل و ذرائع اپنی جگہ بہت مفید اور ضروری ہیں، لیکن یہ ہماری اپنی ابتدائی ذمہ داری کو کم نہیں کر سکتے۔ انسان کی خودی جب تک خود ہی بیدار ہو کر شخصیت و کردار کی تعمیر اور برائی کے حملوں سے اسے بچانے کا عزم نہ باندھ لے، کوئی قانون، کوئی وعظ، کوئی درس، کوئی نفسیاتی تجزیہ، کوئی نظامِ تزکیہ اور کوئی تربیت گاہ آدمی کو صحیح آدمی نہیں بنا سکتی۔ اپنا شعور اگر سویا رہے اور اپنی قوتِ ارادی اگر سُن ہو رہی ہو تو خارج کی ساری تدابیر آہستہ آہستہ بے جان اور غیر موثر ہو جاتی ہیں۔ دل کے اندر کا مزکّی و مربّی اگر مر گیا ہو تو باہر کے مزکیوں اور مربیوں کی تلقینات محض موجبِ سمع خراشی ہوتی ہیں جن کو سُن کر تفکر و تدبر پیدا ہونے کے بجائے اُلٹا اونگھ طاری ہونے لگتی ہے اور باہر سے عائد کردہ بہترین اعمال بھی بے جان معمولات و عادات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

**اصلاحِ نفس کا نقطۂ آغاز** | پس اسلام کو جس طرح اور جس حد تک میں نے سمجھا ہے اس کی رو سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اصلاح کا نقطۂ آغاز آدمی کا یہ احساس ذمہ داری ہے کہ اپنے بھلے اور بُرے یا اپنی اصلاح اور اپنے بگاڑ کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ جس دن یہ احساس انگڑائی لیتا ہے اس دن انقلاب سیرت کا آغاز ہو جاتا ہے اور جب تک یہ احساس سُن ہوا رہتا ہے، ایمان و اخلاق کے لحاظ سے آدمی پستی کے گڑھے میں پڑا کروٹیں لیتا رہتا ہے اور بیشتر یہ ہوتا ہے کہ ساری عمر اسی حالت میں برباد ہو جاتی ہے۔ آخری لمحے آدمی کی روحِ پشیماں فریاد کرتی ہے کہ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ۔

شیطانی قوتیں اس احساس ذمہ داری کو سُلا رکھنے کے لیے بڑے جتن کرتی ہیں۔ وہ نفس کو کئی کئی اقسام کے ملمّع مشروب پلاتی ہیں اور افیون گھول گھول کر بڑے خوشنما پیمانوں میں پیش کرتی ہیں۔ جب تک یہ احساس افیون زدہ رہتا ہے، آدمی اپنی لغزشیں، اپنی غلطیاں اور اپنے ناکارہ پن کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالتا رہتا ہے۔ سارے قصور اسے دوستوں، ساتھیوں [illegible] جماعتی رفقا، معاشرتی ماحول اور سیاسی نظام ہی میں نظر آتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ان [illegible] سوچتا رہتا ہے کہ اگر فلاں ایسا نہ کرتا تو میں پستی میں نہ گرتا، اگر یوں نہ ہوا ہوتا تو میں وہ اور وہ اچھائی پالیتا، اگر حالات ایسے اور ایسے نہ ہوتے تو مجھے موجودہ روش اختیار نہ کرنی پڑتی۔ اسی ذہن کے ساتھ دنیا کا ہر مجرم سوچتا ہے۔ اور وہ قتل اور چوری اور جیب تراشی اور زنا کے جرائم کا ارتکاب کرنے کے بعد ان کی ذمہ داری خارج میں کسی دوسرے کے سر ڈالتا ہے۔

احساس ذمہ داری کے سُن ہونے کی صورت میں دوسری سمت آدمی اپنی اصلاح و تعمیر کا مطالبہ تمام تر دوسروں سے کرتا ہے۔ وہ بظاہر اس بات کا حریص بنتا ہے کہ مجھے نیک ہونا چاہیے اور میری سیرت کو بڑے اعلیٰ معیار پر پہنچنا چاہیے، مگر ساتھ ہی وہ چاہتا یہ ہے کہ دوسرے لوگ معمار بن کر اس کی شخصیت کی عمارت کو اٹھائیں۔ دوسرے ہی اینٹیں ڈھوئیں، دوسرے ہی گارا بنائیں، دوسرے ہی روّے رکھیں اور وہ کھڑا دیکھتا رہے کہ اس کی زندگی کا حسین و جمیل قصر تیار ہو رہا ہے۔ دوسرے اس سے اخلاقی تقاضے منوائیں، دوسرے اس کے اندر شعور ابھاریں۔ دوسرے ہی اس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوتِ ارادی کو پاؤں پر کھڑا کریں اور دوسرے ہی اسے اچھے اعمال پر مجبور کر دیں۔ کوئی حلقۂ درس اس کے اندر قرآن کی محبت بھر دے، کوئی تربیت گاہ اس کی نماز میں روحِ خشیت ڈال دے، کوئی اجتماع اس کے جذبۂ ایثار کو روبعمل لے آئے۔ کوئی اسے اونچی فضاؤں میں اڑا لے جائے۔

پھر جب کہ اس کے مطالبے پورے نہیں ہوتے تو وہ سوچتا ہے کہ کہیں کوئی خرابی ہے، درس و تلقین میں کوئی خرابی ہے، کسی نظامِ تربیت میں کوئی کوتاہی ہے، کسی تنظیم میں کوئی قصور ہے، کسی طریق کار میں کوئی خلل ہے۔ نظامِ مساجد میں فتور ہے، طبقۂ علماء میں بگاڑ ہے، سرے سے نظریۂ دین میں کمزوری ہے، یا اسلام وقت سے پیچھے رہ گیا ہے۔ وہ ہر جگہ خرابی تلاش کرتا ہے اور پا لیتا ہے مگر اسے اپنے اندر کی خرابی کا پتہ نہیں چلتا۔ اسے معلوم نہیں کہ اس کے اندر کا انسان دنیا و مافیہا سے غافل پڑا سو رہا ہے۔ وہ پریشان ہو ہو کر اپنی کوتاہیوں کا الزام دوسروں پر ڈالتا ہے، وہ بڑی مہارت سے تنقید کرتا ہے اور اس کی تنقید بڑی دلچسپ شان کی ہوتی ہے کہ جو کوتاہی خود اس کے اندر سب سے بڑھ کر پائی جاتی ہے اسی کی نشاندہی وہ دوسروں میں کرتا ہے۔ وہ اگر اخلاقی ارتقاء میں خود سست رو ہوگا تو وہ دوسروں کی سستیٔ ارتقاء پر گرفت کریگا، وہ اگر خود تشدد پسند ہوگا تو دوسروں پر تشدد کا الزام تھوپے گا، وہ اگر خود دین کے معاملات میں عدمِ انضباط کا شکار ہوگا تو دوسروں کی ہر بھول چوک پر خیانت کا لیبل لگائے گا۔ اس کا اپنا معیارِ زندگی اگر مسرفانہ ہوگا تو وہ دوسروں کی معتدل روش کو بھی مبالغہ آمیز طریق سے تبذیر کے زیرِ عنوان رکھے گا۔ وہ خود اگر بعض دینی تقاضوں کو پورا کرنے میں ڈھیلا پڑ گیا ہو تو عین انہی تقاضوں کے بارے میں دوسرے بہتر لوگوں کو ناکارہ ثابت کرے گا، وہ اگر خود مصالح کے نام پر بڑے بڑے اصولوں میں لچک پیدا کر لیتا ہو تو دوسروں کو بے اصول ثابت کرنے پر پورا زورِ نطق صرف کر دے گا، وہ جب خود ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جائے گا تو ساری دنیا کے تعطّل کا ماتم کرے گا، وہ جب خود للّٰہیت کا عالم گنوا چکے گا تو دوسروں کے اندر کی روحِ اخلاص کی بربادی کا نوحہ کہے گا اور وہ خود جس مرحلے پر آ کر اعلیٰ نصب العین کے لیے ادنیٰ ذاتی قربانی دے کر دوسروں سے فراخدلانہ تعاون کی [illegible] کھو بیٹھے گا تو دوسروں کی تنگ دلی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اور بے لحاظی کا دھڑا منانے گا۔ حتی کہ وہ جبریہ کے فلسفہ کی آڑ لے کر اپنے بگاڑ کا ذمہ دار خدا تک کو قرار دے لیتا ہے۔

انسان اپنا کیس بڑی خوبی اور مہارت سے مرتب کرتا ہے۔ وہ ہزار جرائم کا ذمہ دار ہونے کے باوجود ایک مظلوم مدعی بن کے انسانیت کی عدالت میں آتا ہے۔ اور نہ جانے کس کس کو مدعی علیہ بنا کر مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا ہے۔ وہ خود ہر حال میں مجبور اور بے بس ہوتا ہے اور دوسرے لوگ ہر حال میں اس کی لغزشوں اور وحشتوں اور نامعقول حرکتوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے پاس اپنے لیے بڑے الاؤنس ہیں، بڑی رعائتیں ہیں، بڑی چھوٹ ہے، بڑی عفو کاریاں ہیں، مگر دوسروں کے لیے اس کے جذبات کا حملہ بھی سنگین ہوتا ہے، اس کی زبان بھی بڑی درشت ہوتی ہے، اس کا استدلال بھی بڑا زوردار ہوتا ہے اور اس کی کسوٹیاں اور معیارات بھی بڑے کڑے ہوتے ہیں۔ انسان عالم فریبی ہی کا نہیں، خود فریبی کا بھی استاد واقع ہوا ہے۔ مگر یہ ساری عالم فریبیاں اور خود فریبیاں اسی دنیا تک ہیں، آخر کار اسے اس مقام پر پہنچنا ہے جہاں کوئی فریب نہ چلے گا اور سارے فریبوں کی قلعی کھل جائے گی اور اسے اپنے نفس کا ذمہ دار آپ ہوتے ہوئے جوابدہی کرنی ہوگی۔

یہ سارے احوال و کوائف اور یہ گوناگوں نفسیاتی تجربے جن سے آدمی گذر رہا ہوتا ہے، محض اس امر کی علامت ہیں کہ اس کے اندر اس کا جو مصلح ودیعت کیا گیا ہے وہ سو رہا ہے۔ اس کا احساس ذمہ داری سن پڑا ہے۔

اسی باطنی مصلح طاقت کو بیدار کرنے کے لیے دعوتِ انبیاء گونجتی ہے کہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ وہ کہتی ہے کہ ہر فردِ انسانی نے جو کچھ خیر اپنے لیے سمیٹا وہی کچھ اس کے پلے پڑنے والا ہے اور جو کچھ شر اس نے فراہم کیا، اسی کا وبال اس کو بھگتنا ہے۔ دوسروں کی بھلائی اس کی برائی کا ازالہ نہیں کر سکتی اور دوسروں کی برائیاں اس کی بھلائی کو ملیامیٹ نہیں کر سکتیں۔ یہاں کا قانون یہ ہے کہ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا کھاتہ الگ الگ کھل رہا ہے۔ آخرت کے بنک میں جو کچھ کسی کا جمع ہے اسے کوئی دوسرا جعلی چیک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر برآمد نہیں کر اسکتا اور جس کا کھاتہ خالی ہے وہ کسی دوسرے کے کھاتے سے کوئی حساب منتقل نہیں کرا سکتا۔ آدمی کی سیرت کی تجوری میں وہی مال داخل ہوتا ہے جو خود اس نے اپنی محنت سے کمایا ہو، دوسروں کی کمائی اس کے سرمائے میں کچھ اضافہ نہیں کر سکتی اور نہ دوسروں کے بہی کھاتوں پر تنقید کر کر کے وہ کوئی حصہ اخذ کر سکتا ہے۔ یہی حق ہے جسے قرآن نے یوں بھی بیان کیا ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ جو کچھ خود بوؤ گے وہی کاٹو گے۔

ذمہ داری کی حس جس دن جاگ اٹھتی ہے تو آدمی اُس دن زندگی کی کھیتی کو زرخیز بنانے کے لیے ایک کسان کی طرح پھاوڑا کندھے پر ڈال کر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کے چٹیل میدان میں ہل چلاتا ہے، وہ مستحکم عادات کے ٹیلے توڑتا ہے، وہ باطل تصورات کی جھاڑیاں اکھیڑتا ہے، وہ الہامی تعلیم کا پانی دیتا ہے، وہ حسنِ نیت کا بیج بوتا ہے —— یہاں تک کہ کردار کی ایک فصل لہلہانے لگتی ہے اور آہستہ آہستہ اس پر سعادت و کرامت کے برگ و بار آتے ہیں۔ پھر جب فصل تیار ہو کر آخرت کے کھلیان میں پہنچتی ہے اور اس کی گہائی ہو جاتی ہے تو وہ حیاتِ دوام کے لیے کھتے بھر لیتا ہے۔

انبیاء کی سعیٔ اصلاح کا اصل ہدف مقصود اسی احساسِ ذمہ داری کو چونکانا اور جھنجھوڑنا اور بروئے کار لانا ہے۔ یہ جاگ جائے تو پھر قسمت جاگ اُٹھتی ہے۔ یہ سوتی رہی تو سرے سے تقدیرِ انسانی سوئی رہتی ہے۔ اس حس کو جگانے کے لیے کائنات میں بے شمار دلائل و مظاہر کام کرتے ہیں، اس کو جگانے کے لیے طبعی واقعات اور نفسیاتی حوادث بڑی خدمت سر انجام دیتے ہیں، اور اسی مسافرِ ازل کو فرض کے راستے پر گامزن کرنے کے لیے الہام کا جرس بجتا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے، دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگی عبارت ہے تیرے جینے سے

پس جس شخص کے اندر یہ حس کام کرنے لگے کہ میں اپنے بھلے اور بُرے کا خود ذمہ دار ہوں اور خود مجھے اپنے دل کو زندہ رکھنا ہے، خود مجھے اپنے دماغ کو اچھے خیالات کا گہوارہ بنانا ہے، خود مجھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی روح کو بالیدگی دینی ہے، خود مجھے اپنے کردار کو سنوارنا اور اپنی زندگی کو شیطانی حملوں سے بچانا ہے۔ اسی کے لیے خدا کی توفیق، مدد اور نصرت حاصل ہوتی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ جو لوگ خدا کی درگاہ کی طرف بڑھنے کا عزم باندھ کر چل کھڑے ہوتے ہیں، انہی کو خدا کی طرف سے رہبری بھی فراہم کی جاتی ہے۔ یہ احساسِ ذمہ داری جب زندہ ہوگا تو سیرت میں معاً ارتقا ہونے لگے گا اور جب اس پر اونگھ طاری ہوگئی، ترقی رک جائے گی۔ سو ہمیں ہر آن یہ دیکھنا چاہیے کہ سینے میں دل زندہ ہے یا نہیں اور دل زندہ کب بیدار اور چوکس ہے اور کب وہ اونگھنے لگا۔ دل جب زندہ و بیدار ہوتا ہے تو آدمی یوں سوچتا ہے کہ میرا فرض کیا ہے اور میں نے کیا کوتاہی کی، لیکن جب یہ مر جاتا ہے یا سو جاتا ہے تو آدمی ساری توجہ اس پر صرف کرتا ہے کہ دوسروں کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور ان سے کیا کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں۔

**اپنے مرتبہ و مقام کا صحیح شعور** میرا ایک حاصلِ مطالعہ یہ ہے کہ انسانی کردار کی اساس اپنے مرتبہ و مقام کے صحیح شعور پر ہے۔ آدمی اپنے لیے اگر غلط مرتبہ و مقام تجویز کرے تو اس کی زندگی خیال کی ننھی سی کونپل سے لے کر اعمال کے اہم ترین برگ و بار تک اور نجی سرگرمیوں سے لے کر بین الاقوامی مشاغل تک ساری کی ساری بگڑ جاتی ہے۔ وہ اصلاح یافتہ اسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ وہ اپنے آپ کو صحیح مرتبہ و مقام پر رکھتا ہے۔ کائنات کی محفلِ وجود میں جب تک وہ اپنی مقررہ نشست کو تلاش نہیں کر لیتا وہ آوارہ و پریشان رہتا ہے۔ یہ نشست پا لیتا ہے تو ٹھہراؤ اور توازن حاصل کر لیتا ہے۔

اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسان کو شعوری طور پر اس کے صحیح مرتبہ و مقام سے آگاہ کیا ہے۔ اسلام کے دیئے ہوئے علمِ حقیقت کی رُو سے آدمی خدا، اپنے ابنائے نوع اور مادی کائنات کی مثلث میں صحیح جگہ اس شعور کے ساتھ پاتا ہے کہ:-

— خدا کے سامنے اس کا مقام عبدیت کا مقام ہے۔

— اپنے ابنائے نوع کے ساتھ اس کا رشتہ اخوت و مساوات کا رشتہ ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

— اور، مادی کائنات پر وہ خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے حکمران و متصرف ہے۔ خدا کے سامنے اپنے مقامِ عبدیت کو پہچان لینے کے بعد کبر، غرورِ علم و قوت اور ظلم و تشدد کے رجحانات کے وہ دروازے بند ہو جاتے ہیں جو انسانیت کو تباہی و ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں۔ عبدیت کا اشتراک تمام انسانوں میں جس رابطۂ اخوت کو استوار کرتا ہے وہ نسلی، جغرافی اور طبقاتی اونچ نیچ اور باہمی کشاکش کا سدِباب کرتا ہے۔ مادی کائنات، اس کے عناصر و قواۃ، فطرت کے فراہم کردہ وسائل کار اور دولت اور ضروریاتِ زندگی کے مقابلے میں انسان جب خلیفۃ اللہ کا منصب اختیار کرتا ہے تو تمدن گریز رہبانیت کا سدِباب بھی ہوتا ہے اور آدمی کی عزتِ نفس بھی بے جا تذلل سے محفوظ ہو جاتی ہے جس کی بنیاد پر سارا احساسِ ذمہ داری کھڑا ہوتا ہے۔

اس مرتبہ و مقام سے انسان جب کبھی آگے بڑھ کر استکبار کے راستے سے خداوندی کے دائرے میں قدم رکھ دیتا ہے تو بھی اس کا کردار غارت ہو جاتا ہے اور اس سے اگر وہ نیچے گر کر اپنے جیسے انسانوں اور مادی مظاہر اور دولت اور مشین کی طاقت کو معبود بنا لیتا ہے تو بھی اس کی سیرت پستی کے حوالے ہو جاتی ہے۔

انسان کو اُس کے اس صحیح مرتبہ و مقام کا علم و شعور تو باہر سے دیا جا سکتا ہے مگر اسے صحیح مرتبہ و مقام پر کھڑا کرنا اور پھر مدت العمر اس پر قائم رکھنا کسی خارجی وسیلے کا مرہونِ منت نہیں ہو سکتا۔ اس مرتبہ و مقام پر کھڑے ہو کر اپنی سیرت کی ترازو کو ڈنڈی سے پکڑ کر تھامے رکھنا اور ہر ہر آن یہ اہتمام کرنا کہ نہ اس کا پلڑا استکبار کی جانب جھکے، نہ تذلل کی جانب، بڑا امتحان ہے۔ دین کی ساری تعلیمات، اخلاق کے سارے ضابطے اور قانونِ شریعت کے سارے اوامر و نواہی اسی ترازو کی قسطاسِ مستقیم کو برقرار رکھنے کے لیے ہیں۔ مگر اسے تھامنے والا ہاتھ اور اس کی نگرانی کرنے والی آنکھ کہیں باہر نہیں ہے بلکہ ہر آدمی کا اپنا ہی ہاتھ اور ہر آدمی کی اپنی ہی آنکھ اس کی ضامن ہے۔ اس وجہ سے زندگی کی اصلاح کی ذمہ داری ہمارے اپنے ہی اوپر عائد ہوتی ہے۔

**نصب العین** | یہ واضح ہے کہ ہم اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے کچھ خواہشات و ضروریات کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



زیر بار ہیں۔ اِن خواہشات و ضروریات کو ہمیں چار و ناچار پورا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن محض اپنی خواہشات و ضروریات پوری کرنے میں لگ جائے تو اس کے اندر اخلاقی زندگی سرے سے کروٹ ہی نہیں لیتی اور کوئی روحانی بالیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ اخلاقی زندگی ایسی ذمہ داریوں سے عبارت ہوتی ہے جن کو پورا کرنے کے لیے اپنی خواہشات کی کچھ نہ کچھ قربانی دینی پڑے۔ دوسرے لفظوں میں اخلاقی زندگی ایثارِ نفس سے شروع ہوتی ہے۔ خواہشات میں تمام تر انہماک ہمیں حیوانی زندگی دے سکتا ہے، لیکن اعلیٰ درجہ کی انسانی زندگی خواہشات کو کسی مقصدِ اعلیٰ پر قربان کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ گویا سیرت بنانے اور زندگی سنوارنے اور روحانی و اخلاقی ارتقا حاصل کرنے کے لیے انسان کے سامنے کوئی ایثار طلب نصب العین اور ذاتی مفاد سے بلند تر کوئی ہدفِ نگاہ ہونا چاہیے۔ بغیر اس کے نیکی، روحانیت، اخلاقی علو، تعمیرِ کردار اور اصلاحِ نفس کا کوئی امکان نہیں۔ نصب العین اور ہدفِ نگاہ جتنا کمتر اور محدود تر یا بلند تر اور وسیع تر ہوگا اسی کے مطابق انسانی سیرت و کردار میں بھی بلندی و پستی اور وسعت و محدودیت پائی جائے گی۔ وہ شخص جو جانور کی طرح فقط اپنے چارے پانی اور تھان اور جوڑے کی طلب میں سرگرم رہتا ہے اس کے اندر سیرت و کردار نام کی کوئی چیز نہیں پائی جا سکتی۔ اس سے بڑھ کر وہ افراد ہیں جو خاندان، قبیلے، نسل، قومیت، وطن، طبقے یا کسی خاص تنظیم یا جتھے کا مفاد سامنے رکھ کر ایثارِ نفس کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے اندر ایک محدود نوعیت کا کردار تشکیل پاتا ہے۔ لیکن اسلام نے ہمارے سامنے ساری انسانیت کا مشترک اور وسیع ترین مفاد بطورِ مقصد سامنے رکھا ہے اور ساری نگاہیں رضائے الٰہی پر مرتکز کی ہیں۔ اسلام کے اس عظیم نصب العین کو صحیح طور پر اپنا لینے سے عظیم درجے کا کردار تشکیل پاتا ہے۔ اس نصب العین سے بڑھ کر کوئی دوسرا نصب العین ایثارِ نفس نہیں مانگتا۔ یہ قیمت میں سب سے بڑھ کر گراں بہا ہے۔

ہر نصب العین آدمی کے سامنے کچھ اصولوں اور تقاضوں کو فرض بنا کر رکھتا ہے۔ ہر غرض خواہشات کے مقابلے پر آ کر قربانی مانگتا ہے۔ فرائض اور خواہشات کے درمیان کشمکش ہوتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور یہ کشمکش زندگی کو ایک امتحان بنا دیتی ہے ؂

عرصۂ عالم میں تیرا امتحان ہے زندگی

اس کشمکش اور حالتِ امتحان میں پڑ کر آدمی کو بار بار ہر آن فیصلے کرنے پڑتے ہیں اور ان فیصلوں کو نبھانا پڑتا ہے۔ امتحان میں پڑنا اور صحیح فیصلے کرنا اور پھر ان کو نبھانا جوہرِ کردار کو نشوونما اور جلا دیتا ہے۔ جیسے کہ سونا بار بار کٹھالی میں پڑ کر کندن بنتا ہے۔

کوئی نہیں جو حالتِ امتحان کا احساس باہر سے آدمی پر ٹھونس سکے، کوئی نہیں جو کشمکش کی ذمہ داری خارج سے تسلیم کرا سکے، کوئی نہیں جو فرض و خواہش کے کسی معرکے میں آدمی کے باطن میں ہونے والے فیصلے کو سمجھ سکے اور اس کو زبردستی صحیح راستے پر ڈال سکے اور کوئی نہیں جو کسی اخلاقی فیصلے کو وفاداری سے نبھانے پر بیرونی دباؤ سے آدمی کو مجبور کر سکے۔

عمر بھر کے اس معرکۂ خیر و شر میں صرف وہی شخص بازی مار لے جا سکتا ہے جو ایک سپاہی کا سا جذبہ اپنے اندر رکھتا ہو، ایک سنتری کی طرح اپنے اصول و فرائض کا پاسبان بنے اور ایک پہلوان کی طرح سفلی میلانات سے کشتی لڑتا رہے۔ جس شخص کے اندر کا سپاہی ہتھیار پھینک چکا ہو، جس شخص کے اندر کا سنتری سو گیا ہو اور جس شخص کے اندر کا پہلوان بے حس و حرکت ہو گیا ہو وہ زندگی کا کھیل ہر چکا۔ کوئی دوسرا اس کے حصے کی جنگ نہیں لڑ سکتا اور کوئی دوسرا اس کی جگہ پہرہ نہیں دے سکتا۔

کسی نصب العین کا قطعی طور پر انتخاب کر لینا۔ اس پر ہمیشہ اپنی نگاہ مرتکز رکھنا، اس کے عاید کردہ فرائض کو اپنے لیے واجب قرار دینا، اس کے تقاضوں کے تحت اپنی خواہشات کی قربانی دینا، اس کی پیدا کردہ کشمکش میں مجاہدانہ انداز سے اقدامات کرنا اور ہر قدم پر مضبوطی سے جمے رہنا خود ہمارا کام ہے، دوسروں کا نہیں!

جو شخص اسلام کو زندگی کا رہنما بناتا ہے وہ گویا اپنے لیے بلند ترین نصب العین طے کر لیتا ہے، وہ اپنے لیے بے شمار فرائض متعین کر لیتا ہے، وہ اپنے اوپر حدود و قیود عاید کر لیتا ہے، وہ ایثارِ نفس کے مواقع سے آگاہ ہو جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو ایک امتحان گاہِ کشمکش میں لا کھڑا کرتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب وہ کیوں یہ چاہتا ہے کہ روز روز کوئی اسے بتلائے کہ تو مسلم ہے، بار بار اسے نئے سرے سے سمجھائے کہ تیرا نصب العین اب رضائے الٰہی ہے، نت اس کے فرائض کی فہرست اس کے سامنے پڑھتا رہے کہ ان کو تجھے پورا کرنا ہے اور ان کے لیے قربانیاں دینی ہیں۔ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر یقیناً ایک اسلامی نظامِ جماعت کی لازمی شان ہے اور ایک نصب العین کے فدائیوں کی رفاقتِ باہمی کا تقاضا بھی ہے کہ وہ بار بار تلقینِ حق کریں، ہمیشہ تذکّر کی فضا آراستہ رکھیں، لیکن اگر ہر شخص اپنی استقامت اور راست روی اور اصلاح کا دار و مدار دوسروں پر رکھے اور اپنی ذمہ داری آپ پوری نہ کرے تو سرے سے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا ماحول ہی نہ بن سکے گا۔

**ضابطہ و معیار کا علم** نیک بننے کے لیے نیکی کا مبہم تصور کافی نہیں۔ سیرت و کردار کو سنوارنے کے لیے ایک واضح ضابطہ و معیار کا علم ہونا ضروری ہے۔ ہر دور، ہر خطے اور ہر قسم کے حالات میں افراد اور اقوام کے اندر بہتر زندگی حاصل کرنے، برائیوں اور خرابیوں سے بچنے اور تعمیر و ترقی کے راستے پر بڑھنے کی خواہش فطری طور پر موجود رہی ہے۔ لیکن بہتر زندگی حاصل کرنے کا راستہ بالعموم غیر واضح رہا ہے۔ جب کبھی راستہ غیر واضح رہا ہے، انسانی قافلے دھندلے قیاسات کے پیچھے پیچھے آوارہ گردی کرتے رہے ہیں۔ انسانیت صلاح و فلاح ایسے ہی کسی دور میں پاسکتی ہے جب کہ صلاح و فلاح کا واضح ضابطہ اسے ہاتھ آیا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا احسانِ عظیم یہی ہے کہ انھوں نے نیکی اور صلاح و فلاح کے ضابطے کو وضاحت کے ساتھ انسانیت کے سامنے رکھا۔ اپنی آخری اور مکمل شکل میں یہ ضابطہ قرآن نے پیش کیا ہے۔

ضابطہ کے ساتھ انسان ہمیشہ اس امر کا محتاج ہی رہا ہے کہ اس ضابطے کے مطابق انسانی زندگی کا عملی نمونہ اس کے سامنے رہے۔ وہ ہدایت حاصل کرنے کے لیے کسی تجریدی فلسفے سے زیادہ کسی عملی مظاہرے سے استفادہ کرتا ہے۔ وہ محض منطقی دعوت و استدلال سے انقلابی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روح اخذ نہیں کرسکتا بلکہ اسے ایسی حکمت درکار ہے جس کے ساتھ عملی تعبیر موجود ہو۔ وہ ایسی منطق چاہتا ہے جو واقعات کے پیرائے میں جلوہ گر ہو۔ وہ ایسے استدلال کا ضرورت مند ہے جس کے اندر انسانی جذبات کی گھلاوٹ ہو۔ دوسرے لفظوں میں وہ مجرد ایک کتابی ضابطے سے مطمئن نہیں ہوتا، اسے چلتا پھرتا پیکرِ محسوس درکار ہے جو اس کتابی ضابطے کو انسانی زندگی میں کارفرما دکھائے۔ اسے ایک اسوہ و معیار کی ضرورت ہے۔ یہ اسوہ و معیار رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستیٔ انور ہے۔

تجربہ گواہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے دوستوں، حلقہ ربط و تعاون، سوسائٹی کے ممتاز شہرت یافتہ افراد اور تاریخی شخصیتوں میں کہیں نہ کہیں اپنے لیے اُسوہ و معیار رکھتا ہے اور پھر اپنے اخلاقی اصول بنانے میں، روزمرہ زندگی کے اقدامات کرنے میں، بات چیت اور رفتار و گفتار کے اسلوب میں، حتیٰ کہ لباس کے انتخاب اور وضع قطع بنانے میں غیرشعوری اور شعوری طور پر اپنے اسوہ و معیار کی پابندی کرتا ہے۔ کچھ خاص ادائیں، کچھ خاص حرکات، کچھ خاص الفاظ اور ان کے لیے خاص لب و لہجہ اور اسی طرح خوشی اور غم، غصے اور رحم، نفرت اور محبت کے کچھ انداز ہم خاص خاص شخصیتوں سے مستعار لیتے ہیں۔ اب جیسا جیسا اُسوہ و معیار کسی نے سامنے رکھا ہوتا ہے اسی طرز کا کردار اس کے اندر پروان چڑھتا ہے۔ کسی کے سامنے ایک فلمی ایکٹر کا کردار ہوتا ہے۔ کسی کے سامنے ایک ناول کا ہیرو ہوتا ہے، کسی کے سامنے کوئی شاعر یا ادیب ہوتا ہے، کسی کے سامنے کرکٹ یا ہاکی کا کوئی کھلاڑی ہوتا ہے، کسی کے سامنے محکمے کا کوئی افسر، پارٹی کا کوئی لیڈر یا ملک کا کوئی وزیر ہوتا ہے۔ بسا اوقات ہمارے متعدد معیارات مختلف اطراف میں بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور ہم مختلف پہلوؤں سے بہت سی شخصیتوں کی تقلید بیک دم کر رہے ہوتے ہیں۔ اسلام نے یہ چاہا ہے کہ ہم اپنی پوری اخلاقی زندگی کے لیے سرورِ عالمؐ کی ایک ہی بے داغ اور بے مثل شخصیت کو اسوہ و معیار بنائیں اور سارا اکتساب وہیں سے کریں۔ انسانی کردار کے لیے یہی سب سے اونچا مقام ہے جس پر نگاہ جما کر بلند ترین پرواز کی جاسکتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس معیارِ سیرت و کردار کی سنّت کا مستند ریکارڈ اس کی پوری تصویر ہمارے سامنے لا رکھتا ہے اور ہماری تاریخ کا ایوان اس کی لازوال روشنی سے جگمگا رہا ہے۔

اسلام کے پیش کردہ ضابطہ و معیار کو ہم قرآن و حدیث سے معلوم کر سکتے ہیں۔ قرآن و حدیث کا علم ہی وہ العلم ہے جس کی طلب ہر مسلم مرد و عورت کے لیے فرض ٹھیرائی گئی ہے۔ اس العلم کے حصول کے لیے مرتبۂ اولین یہ ہے کہ آدمی عربی زبان سیکھے اور براہِ راست استفادہ کرے۔ یہ نہیں تو تراجم اور تفاسیر موجود ہیں ان سے مدد لے۔ حلقہ ہائے درس اور تقاریر سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن اس علم کی طلب کسی میں کتنی ہے کتنی نہیں، یہ بات خود اس کے اپنے اوپر انحصار رکھتی ہے اور یہ امر بھی آخر کار لوٹ کر اسی کے اوپر آتا ہے کہ وہ حاصل شدہ علم کے مطابق کہاں تک اپنے آپ کو سدھارتا ہے۔ اس علم کی پیاس اگر موجود نہ ہو تو چاہے اس کے فوارے ہر طرف کیوں نہ چھوٹ رہے ہوں، ایک آدمی جاہل پڑا رہے گا اور اگر اس کے اندر عملی لحاظ سے جمود پیدا ہو گیا ہے تو چاہے علم اس کے اندر خارج سے ٹھنس بھی کیوں نہ رہا ہو اس کے حق میں بالکل بے نتیجہ رہ جائے گا۔

یہ فرد فرد کا اپنا کام ہے کہ وہ اپنے اندر ضابطہ و معیار کے علم کی پیاس برقرار رکھے اور حاصل شدہ علم کے مطابق عمل و کردار کی اصلاح کی مہم جاری رکھے

**ایک عزم — ایک فیصلہ** اگر ہم انسانی نفسیات کا گہرا جائزہ لیں تو چاہے زندگی کا کوئی کلّی اور ہمہ گیر انقلاب ہو یا کوئی جزئی اصلاح، ہر تبدیلی ہمیشہ ایک عزم اور ایک فیصلے کا نتیجہ ہوتی ہے جب تک ایک مجاہدانہ عزم نہ باندھا جائے اور جب تک قوت ارادی اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر ایک قطعی فیصلے کا اعلان نہ کر دے ہمارے اندر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ بہت سی چیزیں ہیں جن کی ہم تعریف کرتے ہیں اور گفتگوؤں میں ان کو واجب العمل مانتے رہتے ہیں لیکن عملاً ان کو اختیار نہیں کرتے دوسری طرف بہت سی چیزوں کو ہم برا کہتے ہیں اور ان سے بچنے کو وجہ فلاح قرار دیتے ہیں لیکن ساری عمر وہ ہمیں چمٹی رہتی ہیں۔ یہ مجہول حالت محض اس وجہ سے ہم پر برسوں طاری رہتی ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم ایک قطعی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ بلکہ بیچ میں لٹکے رہتے ہیں۔ اصلاحِ نفس کی مہم شروع کرنے کے لیے درجۂ اوّل کی ضرورت یہ ہے کہ آدمی علم و شعور کے مطابق ہر معاملے میں قطعی فیصلہ کرنے اور عزمِ صمیم باندھنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے۔

اسلام ایسا انسان تیار کرنا چاہتا ہے جو خدا و رسول کا فرماں بردار بن کر دوسروں کی بھلائی چاہنے، دنیا میں متاعِ خیر کا اضافہ کرنے اور زندگی کو حسن سے آراستہ کرنے کی مہم میں منہمک ہو جائے۔ اب اس طرز کا ا[illegible]ن وہی بن سکتا ہے جو یکبارگی یہ قطعی فیصلہ کرلے کہ آج سے میں کسی کے ساتھ بُرائی کرنے کے لیے نہ ا[illegible]نے دماغ سے سوچوں گا اور نہ اپنے اعضاء سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہونے دونگا، آج سے میں انسانیت کی متاعِ خیر میں اضافہ کروں گا اور اس متاع کے نقصان کا روادار نہ ہونگا، آج سے میں زندگی ا[illegible]ر تمدن اور معاشرت کو حسن دونگا اور اس میں بدنمائی پیدا کرنے میں کوئی حصہ نہیں لوں گا۔ سرکارِ دوعالمؐ کی دعوت پر جن ہستیوں نے لبیک کہی تھی انھوں نے ایسے ہی قطعی فیصلے کیے تھے اور ایسے ہی عزائم باندھے تھے۔ دنیا نے لالچ اور خوف کے سارے وسائل لے کر ان کے خلاف یورش کی مگر وہ اس دنیا سے اس شدّت سے ٹکرائے کہ اس کے نظام ہائے باطل کے پرخچے اڑ گئے۔ کیا مثال ہو سکتی ہے اس شخص کی جس نے کھجوریں کھاتے کھاتے ایسا ہی قطعی فیصلہ کیا اور آن کی آن میں جہاد کے مورچے پر قربان ہو گیا۔

ایک ہم ہیں کہ دن رات دوسروں کی طرف سے پیش آنے والے جن تجربوں میں ناگواری محسوس کرتے ہیں اور ان کی برائی کا احساس ہوتا رہتا ہے ان سے خود باز نہیں آسکتے۔ بسوں پر جو ہڑبونگ ہوتی ہے، سڑکوں اور گلیوں میں جو غلاظت پھینکی جاتی ہے، بول چال میں زبانوں کی گندگی اور جذبات کی جو تلخی سامنے آتی ہے، نظر بازی اور فقرہ بازی میں جس کمینگی کا مظاہرہ ہوتا ہے اس سے کسے کرب محسوس نہیں ہوتا۔ مگر ہم خود ہڑبونگ مچاتے ہیں، ہم خود غلاظت پھینکتے ہیں، اور اپنی نگاہوں اور زبانوں پر ہم خود قابو نہیں رکھ سکتے۔

کردار وہ لوگ بنا سکتے ہیں جو جس جس برائی کا احساس کریں کہ موجبِ آزار ہے تو اس آن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے ذہن میں عزم باندھیں کہ بس اس لمحے سے میں نے اسے چھوڑنا۔ اس کی زریں مثال مدینہ کی ان جوہر دار ہستیوں نے پیش کی تھی جنھوں نے شراب کی حُرمت کا حکم سنتے ہی ہونٹوں سے لگے ہوئے پیالے الگ کر دیئے یا پھر اُن خواتین نے مبارک اسوہ قائم کیا جنھوں نے حجاب کا حکم سنتے ہی کمر پٹے پھاڑ پھاڑ کر فوراً اوڑھنیاں بنالیں اور گھونگھٹ نکال لیے۔ جو شخص بُرائی کو بُرائی محسوس کر لینے کے بعد اس کو ساتھ لیے لیے چلتا ہے اور جو شخص ایک اخلاقی تقاضے کا شعور حاصل ہو جانے پر بھی اپنے اوپر اسے طاری نہیں کرتا، بلکہ "یہ ہونا چاہیے" اور "یہ نہ ہونا چاہیے"۔ "یہ اچھا ہے"، "یہ بُرا ہے" کے رٹے ہوئے جملے شاعرانہ انداز سے دہراتا رہتا ہے اسے کوئی درس اور کوئی نظامِ تربیت اور کوئی خانقاہ اور کوئی جماعتی ماحول سنوار نہیں سکتا۔ وہ ذہنی جمود اور قلبی فالج کا مریض ہے۔ وہ ہمیشہ اس انتظار میں پڑا رہے گا کہ کوئی اسے پھونک مار کر یا ایک نگاہِ حقیقت ڈال کر کچھ بنا دے اور کوئی زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اخلاقی علو کے مرتبے پر پہنچا دے۔

نیکی کا مقام حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر معاملے میں واضح ارادہ باندھا جائے اور قطعی فیصلہ کیا جائے، فیصلوں کو اصول بنا لیا جائے اور اصولوں کو پائیدار روایات اور مستحکم عادات کی شکل میں ڈھال لیا جائے۔ ہر ارادے کو پورا کرنے، ہر فیصلے کو نبھانے، ہر اصول کا حق ادا کرنے اور عادات و روایات کا پابند رہنے میں قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ قربانیاں ہی ان کو قیمتی اور محبوب بناتی ہیں۔

شخصیت، عادات و روایات ہی سے بنتی ہے۔ فرد کی عادات اور قوموں، خاندانوں اور جماعتوں کی روایات بڑی آہنی طاقت ہوتی ہیں جو کسی خاص طرز کے کردار کی حفاظت کرتی ہیں۔ ایک طریقے پر بار بار عمل پیرا ہو کر ایک شخص اس میں اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ اگر اسے اس کے خلاف کسی حرکت کو دعوت دی جائے تو وہ مجبورانہ انداز سے معذرت کرے گا کہ "ایسا تو میں ہرگز نہیں کر سکتا۔" اسی طرح ایک خاص طرح کی اخلاقی روایات رکھنے والے خاندان یا معاشرے کے کسی فرد سے اگر ان روایات کے خلاف کسی اقدام کا مطالبہ کیا جائے تو وہ غیرت مندانہ انداز سے انکار کر دے گا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



"یہ میرے امکان میں نہیں ہے"۔

ایک علم کے سامنے ہر معاملے میں واضح اور طے شدہ اصول اور فیصلے ہونے چاہئیں کہ میں یہ اور یہ کروں گا اور یہ اور یہ نہیں کرونگا۔ اس کے اعمال کی اٹل حدیں ہونی چاہئیں۔ اس کے اندر نیکی کی مستقل عادات اور روایات قائم ہو جانی چاہئیں۔ اسی لیے اسلام نے کبھی کبھار کے متفرق نیک اعمال کے مقابلے میں اس قلیل عمل کو ترجیح دی ہے جس پر آدمی مداومت اختیار کرے۔ نیکی جو بھی اختیار کی جائے وہ آدمی کی سیرت کا ایک مستقل جزو بن جانی چاہیے۔

اب یہ بالکل واضح بات ہے کہ باطن میں فیصلہ کن عزم باندھنا، عزم کو اصول بنا لینا اور اصولوں کو عادات و روایات میں ڈھال لینا آدمی کے اپنے ہی اوپر منحصر ہے۔ خارج کا کوئی مربّی و مزکّی یہ ذمہ داری سرانجام نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے اندر کے مربّی و مزکّی ہی کو جگانا پڑتا ہے۔

**معرفتِ نفس**

اپنی اصلاح و تعمیر بغیر اپنے آپ کو جانے ممکن نہیں۔ اس کے لیے بڑی ضرورت اپنے نفس کو جاننا اور اس کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ معرفتِ نفس کے معنی یہ بھی ہیں کہ نفسِ انسانی کی فطرت کو جانا جائے اور حدیث کے مطابق اس کے لیے ملکوتی قوت اور اس کے مقابلے میں کام کرنے والی شیطانی قوت کے درمیان جو کشمکش رہتی ہے اس پر نظر رکھی جائے اور اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ خاص طور پر ایک شخص اپنے نفس کے انفرادی امتیازی احوال کو سمجھتا ہو۔

نفس کو اگر ہم ایک مزاجی کیفیت میں چھوڑ دیں کہ اس میں مختلف اچھی اور بُری قوتیں ایک دنگل مچائے رکھیں اور جب جو رجحان بھی زور پکڑ لے، زندگی اسی کے مطابق ڈھل جائے تو اسی مزاجی کیفیت کے ساتھ کسی اصلاح کا امکان نہیں۔ سیرت بنانے کے لیے نفس کا ایک منظم سلطنت کی صورت اختیار کرنا ضروری ہے، جس میں تمام داعیات و رجحانات ٹھیک ٹھیک اپنے مرتبہ و مقام پر رکھے گئے ہوں اور ہر ایک کے لیے اس کی حدود معین ہوں۔

ہر اصلاح طلب آدمی کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ اپنی خاص کمزوریوں کا شعور حاصل کرے۔ بار بار کے تجربات سے ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہماری سیرت کا کمزور پہلو کیا ہے۔ کسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے اندر کبر کا رنگ پایا جاتا ہے، کسی میں غصہ کی تلخی زیادہ ہوتی ہے، کسی میں خود داری کا مرض ہوتا ہے کسی کے جنسی میلانات میں عدم توازن پایا جاتا ہے، کسی میں اسراف یا بخل کے آثار ہوتے ہیں، کسی پر یاسیت کے حملے زیادہ ہوتے ہیں، کسی میں علیحدگی پسندی پائی جاتی ہے، اور کسی میں کچھ اور کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اپنے اندر کی ایسی کمزوریوں کو جان لینا اور ان کے خلاف ایک جدوجہد جاری رکھنا سیرت کو سنوارنے کے لیے انتہائی لازم ہے۔ ورنہ اگر ہم اپنی کمزوریوں کو ڈھیلا چھوڑ دیں تو آخر کار وہ پورے کردار پر چھا جائیں گی۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نفس اور ذہن اور روح کے مرکز پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے جس کا شریعت میں اصطلاحی نام قلب ہے۔ قلب ہی وہ سرچشمۂ اولین ہے جہاں سے خیال اور احساس اور جذبے اور ارادے کے جھرنے پھوٹتے ہیں۔ فساد جب اس سرچشمہ میں آتا ہے تو پھر سارے کردار میں پھیل جاتا ہے اور اصلاح بھی جب اس سرچشمہ کی ہوتی ہے تو ساری سیرت سنور جاتی ہے۔ قلب درست ہو تو یہی اصل مربّی و مزکّی، یہی بہترین مفتی اور جج اور چاق و چوبند پاسبان اور سنتری ہے۔ یہ بگڑ جائے تو پھر باہر کی کوئی امداد ہمیں سنوار نہیں سکتی۔

رسولِ اکرمؐ کی رہنمائی یہ ہے کہ بگاڑ جب آتا ہے تو اسی قلب یا مرکزِ روح میں ایک سیاہ نقطہ نمودار ہوتا ہے۔ آدمی کی نگاہ اگر اس مرکز پر نہ لگی ہو اور وہ اس سیاہ نقطے کو فوراً دھو نہ ڈالے تو یہ نقطہ پھیلنے لگتا ہے، یہاں تک کہ اس کی سیاہی پورے قلب کو محیط ہو جاتی ہے۔ ابتدا میں ایک گندا خیال، ایک گھٹیا جذبہ اور ایک فاسد اقدام سیاہ نقطہ پیدا کرتا ہے۔ اس سیاہ نقطے کا اگر فوراً ازالہ نہ کر دیا جائے تو پھر یہ پھیلاؤ اختیار کر کے سارے نامۂ سیرت کو سیاہ بنا دیتا ہے ایک بیدار دل مسلم اسے نمودار ہوتے ہی توبہ و ندامت کے آنسوؤں سے دھو دیتا ہے۔

اب یہ ظاہر بات ہے کہ اپنے نفس پر نگاہ رکھنا، اپنی کمزوریوں کو جاننا اور ان کے خلاف معرکہ آرا رہنا اور اپنے مرکزِ روح کی پاسبانی کرنا ہر ہر فرد کے اپنے ہی اوپر منحصر ہے۔ اس دائرے میں باہر سے کوئی دوسرا اس کے حصے کا فرض انجام نہیں دے سکتا۔ ہم دوسروں کی مدد کے کتنے بھی

© rasailojaraid.com